ڈاکٹر صنم شاکر
لیکچرار، اسلام آباد کالج فار بوائز، اسلام آباد
ڈاکٹر محمد وسیم انجم
صدر شعبہ اُردو، وفاقی جامعہ اُردو برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی،اسلام آباد

منشا یاد کے افسانے میں سیاست و آمریت کی بازگشت

Reflection of Politices and Dictatorship in Short Stories of Mansha Yadd

Mansha Yaad starts writing in an era that was stir with controversies. The freedom of the expression due to military rule was severely curtailed. Since uncertainty and weariness dominated, the era proved ripe and sufficient for a philosophical literary expression. Resultantly, symbolic modernism paved its way into our literary paradigm. Recurrent of Martial Laws and exploitation of the underprivileged at the hands of the privileged classes is Mansha Yaad's favorite theme. He unmasks the hypocrisy of the rulers.

Keywords: Controversies, Freedom, Expression, Military Rule, Curtailed, Dominated, Resultantly.

کسی بھی ملک کے سیاسی نظام پر وہاں کی اخلاقیات، تہذیب، رسوم و رواج اور اندازِ فکر و عمل اثر انداز ہوتے ہیں۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو پاکستان کی ستر سالہ سیاسی تاریخ میں چار بار عسکری آمریت کے سائے منڈلائے۔ اس جابرانہ اور استحصال زدہ نظام کے تحت فروغ پانے والے معاشرے کی اخلاقیات میں ڈر، جبر، عدم شناخت، بے سمتی، انتشار، بد نظمی، اقرباء پروری اور ان جیسے دیگر مسائل نے تیزی سے فروغ پایا۔ اُردو کے مختلف افسانہ نگاروں نے ان موضوعات کو اپنے افسانوں میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ جابرانہ حکومت کی زد میں نہ آسکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے علامتی پیرائے کا استعمال کیا گیا ہے۔ جبر کے خلاف آواز اُٹھانے کا یہ رجحان مزاحمتی ادب کے دائرے میں آجاتا ہے۔ آزادی اور مساوات کے حق میں اور مارشل لاء کے جبر و ستم کے خلاف لکھا جانے والا ادب دراصل ایک ردِ عمل جس کا عوام تو اظہار نہ کر سکے لیکن ادیبوں نے ان کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے افسانوں کے ذریعے اس مزاحمت کو موضوع بنایا۔

پاکستان کے سیاسی منظر نامے پر اختصار سے نظر دوڑائی جائے تو سب سے پہلے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ۱۹۵۸ء مارشل لاء لگایا جو ۱۹۶۹ء تک جاری رہا۔ جنرل محمد ایوب خان سیاسی جماعتوں کی مخالفانہ تحریک کے پسِ منظر میں ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے۔ تب ہی جنرل محمد یحییٰ خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے۔ بعد ازاں صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ یوں ملک ایک اندھیرے سے دوسرے اندھیرے میں اُتر گیا۔ جو سب سے زیادہ خوفناک تھا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل محمد ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کیا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ اپنے طویل آمرانہ دور کے بعد ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو فضائی حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ چند برس تک جمہوریت رہی مگر پھر ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو پرویز مشرف نے چیف ایگزیکٹو کا عہدہ سنبھال لیا۔ ۲۰ جون ۲۰۰۲ء کو صدر کی حیثیت اختیار کی اور حکمرانی کرنے لگے۔ لیکن ملٹری تمغے کو اپنے ساتھ چپکائے رکھا تاکہ آمریت کے خلاف آواز بلند نہ ہو سکے۔ ۲۰۰۸ء میں عوامی اور سیاسی دباؤ بڑھنے پر انتخابات کروائے جس میں ناکام ہو کر مجبوراً سیاست چھوڑنا پڑی۔

آمریت کے ان ادوار نے ادب کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ پہلے مارشل لاء نے معاشرتی تضادات، معاشی ناآسودگی اور اخلاقی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ کا گہرا احساس پیدا کیا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں کے رویے میں ایک تلخی، بے زاری اور جھنجھلاہٹ دیکھی جاسکتی ہے۔ علامتی افسانے اسی دور کی پیداوار ہیں۔ بیشتر علامت نگاروں نے اپنے افسانوں میں کچھ ایسا اُلجھا ہوا اور پیچیدہ اندازِ بیان اختیار کیا جو عام قاری کی فہم و فراست سے ماوراء نظر آتا ہے۔ اس لیے ان افسانوں میں ابلاغ کی کمی نے ابہام کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ عدم ابلاغ کی وجہ سے علامتی اور تجریدی افسانوں میں اپنی اہمیت کو بھی منوایا۔ اسی عہد کے افسانہ نگاروں میں فنی مہارت کے ساتھ ساتھ موضوعات کا تنوع اور گہرائی بھی ملتی ہے کیونکہ وہ افسانہ نگار اپنے زمانے کے بدلتے تیوروں سے آگاہی رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس دور میں بھی اُردو افسانے نے کسی حد تک ترقی کی منازل طے کیں۔ بدلتے حالات میں اُردو افسانے تغیر و تبدل کے فلسفے کو اپنے فکر کا موضوع بنایا۔ یہاں خیر و شر کی تصویر نظر آتی ہے اور اس خیر و شر کا تعلق بدلتے سیاسی حالات خاص طور پر آمریت سے بنتا ہے۔ جس میں سیاسی استحکام مفقود ہو جاتا ہے۔ جبکہ عوام سماجی، معاشی اور معاشرتی نظام کا استحکام دیکھنا چاہتی ہے۔ آمریت کے دور میں آزادیِ اظہار پر پابندی اور سزاؤں کے خوف کے اثرات ادب پر مرتب ہوتے رہے۔ کچھ ادیبوں نے بلاخوف و خطر برملا سچی باتیں بھی کیں اور اظہارِ رائے کی آزادی کو ضروری سمجھا۔ لیکن عام طور پر یہ رجحان شاعری تک محدود رہا۔ البتہ چیدہ چیدہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں بھی اُبھرا۔ لیکن مجموعی طور پر افسانہ

نگار بیرونی دنیا سے مایوس ہو کر اپنے تخیل میں پناہ لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی عہد کے اہم اور منفرد افسانہ نگار منشایاد بھی سیاسی عصرِ حاضر کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ منشایاد نے گہرے مشاہدے اور دردمند تخلیقی احساس کی بدولت ہمارے سماجی ڈھانچے اور سرکاری حکمت عملی کے تضادات کو اپنی کہانیوں میں اُجاگر کیا ہے۔ سیاسی ناکامی کے نتیجہ میں سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ پیش آیا۔ ان حالات کے تناظر میں منشایاد کے پہلے افسانوی مجموعہ "بند مٹھی میں جگنو" کا افسانہ "دوپہر اور جگنو" سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں ہے۔ جس میں جنگ کی تباہی اور انسانوں کی نفسیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آگ اور خون کا کھیل اقتدار کے بھوکے لوگوں کی رُزو ہے۔ جس میں لوٹ مار، قتل و غارت گری، دوسروں کو نیچا دکھانے اور خود برسرِ اقتدار آنے کی ہوس نظر آتی ہے۔ جس کے تحت عدم تحفظ کا احساس، معاشی اور معاشرتی ناہمواری کی تصویر نمایاں ہوئی۔

> "اس کی نظر روشن دان پر لگے ہوئے خاکی رنگ کے کاغذوں پر پڑتی ہے۔ ان کھرچے ہوئے کاغذوں کو دیکھ کر اسے بلیک آؤٹ یاد آتا ہے۔ پھر اس کے کان میں سائرن کی آواز گونجتی ہے۔
>
> خندق۔۔۔۔۔دھماکہ۔۔۔۔۔خون۔۔۔۔۔لاشیں۔۔۔۔۔۔دھواں اور گھپ اندھیرا۔۔۔۔"
>
> مگر یہ سب تو خواب تھا۔
>
> "بنگلہ دیش"۔۔۔۔۔۔۔۔مکتی باہنی!!"
>
> عجیب واہیات خواب تھا
>
> لیکن یہ مکتی باہنی کیا ہوتی ہے۔ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے ذہن سے کیوں چپک گیا ہے کہیں یہ خواب کی بجائے کوئی حقیقت نہ ہو کہ ہم جنگ ہار گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔اس کا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ خدا کرے یہ خواب ہی ہو۔۔۔۔۔۔خواب کی کرچیاں اس کے دل کو لہولہان کرنے لگتی ہیں۔
>
> اس کے ذہن میں توپ دغنے لگتی ہے "شکست۔۔۔۔۔شکست۔۔۔۔۔شکست"
>
> دھماکوں کا دھواں کم ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ الفاظ اُبھرتے ہیں۔

"پاسپورٹ۔۔۔۔بائیس خاندان۔۔۔۔۔زرِمبادلہ۔۔۔۔بنگلہ بندھو۔۔۔۔۔۔قومی
ملکیت۔۔۔۔۔عوامی حکومت!" (۱)

یہ سانحہ پوری قوم کے لیے اعصاب شکن ثابت ہوا۔ طبقاتی فرق نمایاں ہونے پر نفسیاتی دباؤ بڑھا جس کی نشاندھی ادب خاص طور پر افسانوں میں نظر آتی ہے۔

منشایاد کا ایک اور افسانہ "بچھڑے ہوئے ہاتھ" بھی سقوطِ مشرقی پاکستان کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ کہانی اس دُکھ اور درد کی عکاسی کرتا ہے کہ پاکستان کا ایک حصہ کٹ کر جُدا ہو گیا۔ ملک کو ایک جسم سے تشبیہ دی گئی۔ یوں جسم اس حصے کی کمی محسوس کرتا رہتا ہے۔ بالکل ایسے ہی پاکستانی عوام و خواص نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو محسوس کیا۔ افسانے میں بظاہر ماڈرن سرجری کے کرشماتی کارنامے دکھائے گئے ہیں۔ سرجری کسی بھی پائے کی کیوں نہ ہو لیکن اُس سے پیدا ہونے والی محرومی انسان کے ساتھ چپکی رہتی ہے۔

"حالانکہ ب کے جسم کی لگام تھامے وہ جہاں چاہتا ہے اس کے پاؤں سے چلتا پہنچ جاتا ہے اور ب کے ہاتھ پاؤں اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں پھر بھی اسے اپنے ہاتھ پاؤں بہت یاد آتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ب کا جسم اس کے اپنے جسم سے زیادہ تروتازہ ہے لیکن اسے اپنے جسم کی یاد بہت ستاتی ہے۔" (۲)

پاکستان کے اہلِ دانش کے لیے یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ جسے تاریخ فراموش کر سکتی ہے نہ ہی باشعور طبقہ۔ اس کے نتائج آج تک قوم کو بھگتنے پڑ رہے ہیں۔

"سورج کی تلاش" وہ افسانہ ہے جو ہجرت کے پسِ منظر میں لکھا گیا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کے لیے خواب دیکھا اور کتنی قربانیاں دیں۔ جس کو منشایاد یوں بیان کرتے ہیں۔

"راستہ دشوار گزار تھا قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی تھیں۔ سب سے زیادہ ٹھوکریں آگے والے حصے میں آئی تھیں۔ وہ بوڑھا تھا ان ٹھوکروں اور سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کے لیے ان سے جُدا ہو گیا۔" (۳)

یہ بات یقیناً مسلمانوں کے لیڈر قائداعظم محمد علی جناح کے بیے لکھی گئی ہے جنہوں نے اس قوم کی رہبری کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اس سے محرومی نے پاکستان کی سرزمین پر رہنے والوں کو مسائل میں مبتلا کر

دیا جو حل ہونے میں نہیں آرہے۔ مسائل کے شکنجے میں مبتلا کچھ لوگ دہشت گردی کی طرف مائل ہوئے اور طبقاتی فرق کو بھی ان حالات نے جنم دیا جسے قوم بننا تھا وہ گروہوں میں منقسم ہو گئی۔

> "تینوں گروہ آپس میں دست و گریباں تھے کہ قریب کا آتش فشاں پھٹ پڑا اور بہت سے لوگ سرنگ کے اندر پتھروں اور چٹانوں کے نیچے دب کر مر گئے۔"(۴)

ہجرت کے موضوع پر اور پاکستان کے نئے حالات کی جس طرح اس افسانے میں نشاندہی کی گئی ہے۔ شاید اس موضوع پر لکھی جانے والی تاریخ بھی ان واقعات کی ایسے کربناک انداز میں ترجمانی نہ کرپاتی۔

"رُکی ہوئی آوازیں" مارشل لاء کے نتائج کی نشاندہی پر یہ افسانہ اپنے اندر علامتی انداز رکھتا ہے۔ اس کی کہانی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی ہے جس کے باپ دادا مرتے ہیں تو عالیشان مکان پر خود غرض لوگ قابض ہو جاتے ہیں اور وہ مالک ایک کونے میں بے بسی سے پڑا رہتا ہے۔ اسے کھانے کے لیے بھی باسی کھانا دیا جاتا ہے۔

خود غرض اور ظالم حکمرانوں نے عوام سے کیے گئے وعدوں کی پاسداری کو پس پشت ڈال دیا اور محض اپنے مفادات کی خاطر کرسی سنبھالتے ہی عوام کی بھلائی کو فراموش کر دیا گیا۔ اس افسانے میں مارشل لاء کے اثرات سے جنم لینے والے حالات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ منشایاد رُکی ہوئی آوازوں کو راستہ دیتے ہیں اور یہ رُکی ہوئی آوازیں خود کلامی کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ ایسی خود کلامی جو اس عہد کے ہر ذی شعور آدمی کے اندر جاری تھی۔

> "اور جمع ہونے لگیں اس کے اندر کی آوازیں اور برسوں کی رُکی ہوئی باتیں اور مچلنے لگے غصے اور جوش کے جذبات اور پھٹنے لگا اس کا سینہ۔ رُکی ہوئی باتوں اور آوازوں کے شور سے اور سنا دیا ہم نے تمہیں ایک دلچسپ قصہ۔ اس شخص کا جو ایک روز بادل کی طرح گرجے گا اور لرز جائیں گے سب اس کی آواز سُن کر جس میں　برسوں کی رُکی ہوئی چنگھاڑ ہو گی۔"(۵)

"۱۹۷۸ء کا آخری افسانہ۔۔۔۔۔۔پناہ" میں بھی مارشل لاء کا جبر پس منظر کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ حبس اور جبر کی فضا آمریت کی پیداوار ہے۔ معاشرے کے افراد نفسیاتی اثرات میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ سیاسی حالات کے نتیجے میں معاشی بدحالی، معاشرتی انتشار اور نفسیاتی کشمکش جنم لیتی ہے۔ آمرانہ نظامِ حکومت میں اظہارِ رائے کی آزادی ممکن نہیں۔ تو ایسی صورتحال میں بے بسی اور بے یقینی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ مارشل لاء جمہوریت کو تباہ کر دیتا ہے کیونکہ فردِ واحد ہی تمام اختیارات کا مالک بن جاتا ہے۔ لہٰذا عوام کی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اس افسانے میں ایک

ایسے شخص کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کی عکاسی ہے جو ہجوم کے ساتھ چل رہا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ اور کہاں جا رہا ہے۔

> "اُسے پتا نہیں چل رہا کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ کدھر جا رہا ہے؟ شاید کوئی جلوس ہے۔۔۔۔ مگر کب اور کیسے جلوس میں شامل ہوا۔ اُسے کچھ یاد نہیں آرہا۔ کیا پتا اس کی دردِزہ سے کراہ رہی ہو اور وہ ڈاکٹر بلانے یا ایمبولینس لانے کے لیے گھر سے نکلا اور جلوس میں شامل ہو گیا۔"(۶)

دراصل ایک فرد کا ہی نہیں بلکہ پوری قوم کا المیہ ہے جو جبر اور ظلم کے سائے میں رہتی ہے لیکن ی ساتھ ہی ردِ عمل بھی رہتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے علامتی انداز سے ان المیوں کی نشاندہی کی ہے جو مارشل لاء تھے۔ جبر میں پابندیاں منڈلاتی پھرتی ہیں جس سے معاشرہ کے ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔

سیاسی جبر کے خلاف منشایاد کا افسانہ "دھوپ، دھوپ، دھوپ" بھی زیر غور ہے جس میں آمریت اور سیاست کی بے اعتدالیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی خیال جبر کے خلاف احتجاج ہے اور دھوپ کو جبر کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے وقت کے تھم جانے اور دھوپ کا گھروں کے اندر بسیرا ڈال لینے کی طرف اشارہ ہے۔

آمریت جاگیردارانہ نظام، معاشرتی اور سیاسی ظلم کی بے اعتدالیوں کو نہ صرف تحفظ دیتی ہے بلکہ ایسے رویوں کو بھی فروغ ملتا رہتا ہے۔ چنانچہ منشایاد کا افسانوی مجموعہ "خلا اندر خلا" کا افسانہ "بوکا" میں بھی آمریت کے خلاف احتجاج ہے۔ "بوکا" جمہوریت کے فروغ کی علامت ہے۔ اس افسانے میں دیہی زندگی سے اخذ کیا ہوا استعارہ اور باپ بیٹے کا رابطہ اجتماعی معنویت کو پیش کرتا ہے۔ "ہر رات کے بعد اُجالا ضرور پھیلتا اور چیزوں کی اصلی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔"(۷)

منشایاد کا افسانہ "تماشا" بھی سیاسی شعور کا عمدہ عکاس ہے۔ یہ تمثیلی افسانہ مارشل لاء کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں پاکستان کی سیاسی صورتحال کی ترجمانی عمدگی سے کی گئی ہے۔ یہاں پر ہر طرف بکھری دہشت ناکی، اسرار کی گھمبیرتا اور بگڑی ہوئی مسخ شدہ تصویریں اس سیاسی صورتحال کا پرتو ہیں۔ یہ باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی بات چیت سیاسی صورتحال کا بھرپور تجزیہ ہے۔

''یہ ایسا ہی کرتے ہیں ضرورت سے زیادہ مچھلیاں مار مار کر جمع کرتے ہیں مگر کھاتے وقت آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور شکار کو خراب اور ایک دوسرے کو لہو لہان کر دیتے ہیں۔''(۸)

بہت ہی واضح انداز میں اس افسانے میں حکمرانوں اور بر سرِ اقتدار فوجیوں کے رویوں کی نشاندہی ہے۔

افسانوی مجموعہ ''وقت سمندر'' میں زندگی کی مختلف جہتوں کی نمائندگی ہے۔ خاص طور پر فکر و خیال اور سیاسی و سماجی زندگی کا وہ رویہ جس نے سماج میں سفاکی کو فروغ دیا اور افرادِ معاشرہ میں زندگی اور ظلم و ستم نظر آنے لگا۔

افسانہ ''دام شنیدن'' میں سماج کے رویے کی عکاسی ہے۔ یہاں پر انسان کی درندگی اور ظلم و ستم کو موضوع بنایا گیا ہے کہ انسان کے منہ میں بھی بھیڑیے کے دانت ہیں۔ اگر وہ درندہ نہیں ہے تو ماس خور کیوں ہے؟ یہاں تک کہ وہ اپنے پالتو چرند پرند کو بھی کاٹ کر کھا جانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس کی اسی سفاکیت کا احوال بکریوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے نمایاں ہوتا ہے۔

''ذبح کس طرح کرتے ہیں؟''

''زمین پر لٹا کر چھری چلا دیتے ہیں'' بڑے نے کہا

''تکلیف تو ہوتی ہو گی؟''

''ہاں میں نے ایک بار دیکھا تھا بڑی دیر تک جان نکلتی رہتی ہے۔''

''ذبح کیوں کرتے ہیں؟''

''کھانے کے لیے۔ ان کے منہ میں بھی بھیڑیے کے دانت ہوتے ہیں۔'' (۹)

یہ سفاکی اور ظالمانہ طرزِ عمل انسان دشمنی سے پیدا ہوتا ہے جو بالخصوص مارشل لاء، بادشاہت اور غیر جمہوری طرزِ حکومت کی دین ہے۔ منشایاد نے اپنے افسانوں میں معاشرے میں موجود طبقاتی فرق کو نمایاں کیا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں سیاسی رویے اور رجحانات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ معاشی اور سماجی مسائل ہی نہیں بلکہ سیاسی اونچ نیچ کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ ظلم و بربریت، تشدد، دہشت گردی یہ سب کمزور حکمرانوں کے زیرِ پروان چڑھنے والے رویے ہیں چنانچہ سیاست زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی منشایاد کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"منشا یاد کی کہانیوں میں ہمارے عہد کی سیاہ کاریوں کی پوری روداد موجود ہے۔ یہ کہانیاں دستاویزی ثبوت ہیں۔ جیسے قدیم عہد نامے کی کہانیاں اور کتاب مقدس کی قصص۔۔۔۔۔۔منشایاد صرف افسانہ نگار ہی نہیں اپنے عہد کا گواہ بھی تھا۔"(۱۰)

"اگلی صف کا آدمی" بھی سیاسی موضوع لیے ہوئے ہے کہ اگر پہلی صف کے لوگ غلط ہو جائیں تو پورے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر قائد یار ہنما ہی رہزن ہو اور اس میں قائدانہ صلاحیتوں کا فقدان ہو تو اس سے عوام کی اصلاح نہیں ہوا کرتی۔ جو خود منزل کی طرف رواں دواں نہیں اس کی قوم لا محالہ راستے سے بھٹک جاتی ہے۔

"ایندھن" افسانے میں جنگ کے دوران ایندھن بنتے ہوئے لوگ پیش کیے گئے ہیں جن کی وجہ سے نسلِ انسانی کی بیخ کنی ہوتی اور ملکوں میں خاک و خون کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ انسانوں کو حقیر کیڑے مکوڑوں کی طرح صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے کے افراد نہیں جانتے کہ وہ کسی گنہگار یا بے گناہ کا قتل کر رہے ہیں۔ گولیاں اور اسلحہ بارود بنانے والوں میں احساسِ ندامت باقی نہیں رہتا۔ جو یقیناً حکومت کی کمزوری ہے۔ انسان دُعا گو رہتا ہے اس کا دماغ اور سوچ منجمند ہو جاتی ہے اور وہ نہیں جانتا کہ انسانیت کی بردباری خود اُسے کہاں لے جائے گی۔

"وقت سمندر" میں موجود افسانہ "خوف ۸۵" بھی اُس دور کے جبر اور گھٹن کا بیان ہے جو ضیاء الحق کا دور تھا۔ جس میں ریاکاری اور بڑھتی ہوئی منافقت معاشرے میں عام تھی۔ منشایاد نے اپنے گردوپیش کی جو تصویر بنائی ہے وہ "خوف ۸۵" افسانے میں بہت واضح ہے۔ یہاں سیاسی شعور کی معنویت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ وقتی دہشت کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ کبھی ہتھوڑا گروپ، کبھی دہشت گردی کا خوف، دھماکے اور ٹارگٹ کلنگ کی کاروائیوں کے ماحول نے شہریوں کو بے سکون کر رکھا تھا۔ نفسیاتی طور پر خوف و ہراس کی فضا میں انسان ذہنی مریض بن جاتا ہے۔ عدم اعتماد اور بیگانگیت اس کے احساس کو پارہ پارہ کیے رکھتی ہے۔

"ایک صبح دروازہ کھولا تو ایک بوری دروازے کے باہر پڑی تھی جس میں ایک ہتھوڑا رکھا تھا۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔اب پولیس اس کے گھر کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کے باوجود گھر اور محلے کے سب لوگ جاگ کر رات گزارتے ہیں اور ذرا کہیں کھٹکا ہو جائے تو ہڑبونگ مچ جاتی ہے۔"(۱۱)

یہی وہ اسباب ہیں جو معاشرے کو عدم استحکام کی طرف راغب کرتے ہیں اور قوم تباہی کے دھانے پر پہنچ جاتی ہے۔ افسانہ "زوال" سے پہلے" میں حکمران طبقے کی نااہلیوں اور ستم ظریفیوں کو موضوع بنایا گیا ہے کہ یہ طبقہ

خیر و شر کی جنگ میں محض تماشائی کا کردار ادا کر کے اپنی اپنی دنیاوی لذتوں میں گم ہے۔ لوگوں کی ذمہ داری سے منہ موڑ کر اپنے اپنے محلات اور بنگلوں کی حفاظت اور ناجائز ذرائع سے اپنی تجوریاں بھرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جبکہ عوام ان کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہی ہے۔ اس طبقے سے وابستہ سب لوگ سنگین جرم میں برابر کے شریک ہیں اور عوام کے دکھوں میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔

> "اُن کے نعمت خانوں اور اناج سے بھرے گوداموں کے باہر فاقہ زدہ لوگ اور ان کے ڈرگ سٹورز اور دواخانوں کے باہر مریض دوا نہ ملنے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے تھے۔ مگر ان کے دل نہ پسیجتے تھے۔"(۱۲)

سیاست کا زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے ادیب ادب پر سیاسی اثرات کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ منشا یاد نے بھی اپنے افسانوں میں سیاسی صورتحال اور بین الاقوامی رویوں اور حالات کا ذکر چابکدستی سے کیا ہے۔

"بچے اور بارود" افسانے میں مصنف نے جنگ کی تباہ کاریوں کو موضوع بنایا ہے۔ افسانے کی ابتدا انٹرویو کے انداز میں ہوتی ہے۔ یہ انٹرویو سوال وجواب پر مبنی ہے۔ جو ایک لڑکی اور ایک عورت کے مابین ہو رہے ہیں عورت وہ جس کا شوہر اور بیٹا جنگ کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ دھماکوں نے اس کے اعصاب کو شل اور کانوں کو بہرہ کر دیا ہے۔ اُس کے لہجے کی آزردگی اور اُداسی جنگ کے حالات وواقعات کو اور بھی تکلیف دہ بنا دیتی ہے۔ اپنے معصوم بیٹے کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے اُس کا لہجہ بھرا جاتا ہے۔ یہ عورت اُن حالات کا استعارہ اور نمائندہ ہے جو جنگ سے انتہائی طور پر متاثر ہوئی اور قیمتی رشتے اُس سے جُدا ہوئے۔ بموں کے دھماکوں کی آوازوں سے اس کے کانوں کے پردے پھٹ چکے تھے یہ افسانہ اُن درندوں کو بے نقاب کرتا ہے جو انسانیت کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ جنگوں کو ایندھن صرف انسانوں کے روپ میں چاہیے۔ اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ بچے، بوڑھے اور عورتیں ہی کیوں نہ ہوں۔ معصوم بچوں کو ترغیب دے کر بارودی سرنگوں کے درمیان بھگانہ انسانیت کی تذلیل ہے۔ افسانے کا آخری جملہ اس کسمپرسی کی نشاندہی کرتا ہے جب وہ عورت یہ کہتی ہے۔

> "میری دنیا کی تمام بہنوں سے اپیل ہے کہ جب تک پہلے جنے ہوئے خونریزیوں سے باز نہ آجائیں بچے پیدا کرنا چھوڑ دیں۔" (۱۳)

باوجود اس کے کہ یہ جنگ کے اثرات کے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے جو سیاسی حالات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ سماجی طرز فکر کا عکاس بھی ہے۔ افسانوی مجموعہ ”درخت آدمی“ میں شامل افسانہ ”سینگ و سرگم“ منشا یاد کے سیاسی و سماجی شعور کا غماز ہے۔ وہ ملک میں سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر ہونے والی اونچ نیچ کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں کہ پورا ماحول نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

”سلطنت میں اب کہیں سے گانے، گنگنانے، چہچہانے اور ساز بجانے کی آواز سنائی نہ دیتی مگر منشیات کے استعمال میں کمی نہ ہوئی۔ لڑائی جھگڑوں اور خوں ریزیوں کے واقعات میں اضافہ ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے۔“ (۱۴)

یہی وہ سماجی حالات ہیں جو سیاسی بدحالی پر منتج ہوتے ہیں اور جس میں لاقانونیت عیاں ہوتی ہے۔ افسانہ ”سلاٹر ہاؤس“ میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر ترقی پذیر جدید زندگی کے خطرات کی شدت کو موضوعِ بحث بنا کر احتجاج کیا گیا ہے۔ یہاں پر منشا یاد دنیا کو ایک ایسا سلاٹر ہاؤس قرار دیتا ہے جہاں نہ صرف انسانیت کی تحقیر و تذلیل ہوتی ہے۔ بلکہ انسان ہی انسان کے لیے باعثِ آزار ہے۔ ظلم و بربریت، تشدد و دہشت گردی کے زیرِ اثر حالات و واقعات نے انسانی زندگی اجیرن بنا دی ہے۔ خوف و ہراس، بے یقینی اور عدم تحفظ کے خوفناک سائے ہر طرف منڈلاتے نظر آتے ہیں۔

”یہاں قتل و غارت اور سفاکی کا چلن عام ہو گیا ہے۔ یہاں کوڑوں سے کھال ادھیڑی گئی۔ کُند آلات سے لوگوں کے سر کچلے گئے۔ دھماکے، لاشیں، خون اور مجروحین کی چیخ و پکار روزمرہ زندگی کا معمول بن گئے۔۔۔۔۔ لسانی، سیاسی، علاقائی اور فرقہ وارانہ اختلافات اور فسادات نے بستی کی فضا کو اس قدر مسموم کر دیا ہے کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے۔“ (۱۵)

افسانوی مجموعہ ”تماشا“ جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا ایسے ہی سیاسی حالات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جو بدستور چلے آرہے ہیں۔ ”تماشا میرے آگے“ افسانہ میں سیاسی و سماجی شعور کی جھلک واضح نظر آتی ہے اور اسے تمثیلی انداز میں موجود عہد کے سیاسی و سماجی ماحول سے ہم آہنگ کیا ہے۔

''اس کہانی میں ایک جنگل کا ذکر تھا میں بہت خوش ہوا کہ ہمارے معاشرے کی لیے جنگل بہت بلیغ استعارے کا کام دے گا کہ یہاں بھی وہی قوانین چلتے ہیں مگر جنگل کے کیا قانین ہوتے ہیں۔ اس پر تھوڑا سا غور کیا تو اندازہ ہوا کہ صرف ایک ہی قانون ہے طاقتور کمزور کو مار کر کھا جاتا ہے۔''(۱۶)

نسلوں کا تفاوت صرف معاشرتی زندگی میں ہی نہیں بلکہ سیاست میں بھرپور طور پر نظر آتا ہے۔ سیاسی و ملکی حالات و واقعات اور دہشت گردی کے تناظر میں منشایاد کا افسانہ ''سارا سفر افسوس کا ہے''اہمیت کا حامل ہے جس میں ملکی اور سیاسی حالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ کہانی دہشت گردی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خوف کے گرد گھومتی ہے۔

''موٹر سائیکل پر سوار دو دہشت گردوں نے تین آدمیوں کو فائرنگ کر کے ہلاک کر ڈالا۔'' (۱۷)

یہ دہشت گردی صرف پاکستانی سیاست کی کمزوری کا نتیجہ ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی حالات بھی اسی کے پس منظر میں دیکھے جاسکتے ہیں کہ بہت ترقی یافتہ ممالک میں بھی تخریب کار اپنی کاروائیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں یہ تخریب کار دراصل اہٹم بم کی ایجاد ہیں۔ دہشت گردی کے اثرات کی بدولت آدمی حقیقت کے برعکس لرزہ خیز فکر و خیال میں مبتلا ہو کر جہنم زار بنائے چلا جارہا ہے۔

''اطلاع آئی ہے کہ کسی تخریب کار نے گاڑی میں ٹائم بم رکھ دیا ہے۔ وہ دہل گیا۔
'تیرا میرا سفر افسوس کا ہے'۔'' (۱۸)

افسانہ ''کہانی کی رات'' بھی سیاست و آمریت کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب بھی کسی حکومت کا تختہ اُلٹتا ہے تو قومی چینل فوراً بند کر دیا جاتا ہے۔ پھر کچھ توقف کے بعد تلاوت و قومی ترانہ سنایا جاتا ہے۔ نیا چہرہ اُبھرتا ہے اور عہدہ سنبھالنے کے حوالے سے قوم سے خطاب کرتا ہے۔ اس افسانے کی ابتداء میں چینل بند ہوتا ہے اور اختتام میں تلاوت قرآن پاک سے دوبارہ قومی چینل کی نشریات کا آغاز ہوتا ہے۔ عوام میں بے چینی اور تجسّس کی کیفیت نمودار ہوئی اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ چنانچہ ان حالات کی نشاندہی میں افسانہ نگار لکھتا ہے۔

''یکایک سکرین سیاہ ہوگئی

لگا، کمرے میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ میں نے ریموٹ کنٹرول سے اس سیاہ بخت کو اُلٹنے پلٹنے اور روشنی کی کوئی لکیر تلاش کرنے کی کوشش کی مگر جب زندہ یا مردہ کوئی منظر دکھائی دیا نہ انسانی آواز ہی سنائی دی تو گھبرا کر ٹیلی فون ملا دیا 'ہیلو میری سکرین سیاہ ہو گئی ہے' 'میری بھی' 'اس کا مطلب ہے سب کی'

دماغ میں مخالف سمتوں سے ایک ہی پٹڑی پر چڑھ آنے والے ریلوے انجنوں کے ٹکرانے کا سا دھماکہ ہوا۔ اس نے کہا 'کوئی ٹیکنیکل فالٹ بھی تو ہو سکتا ہے'

'نہیں' میں نے جواب دیا 'میرا خیال ہے کچھ ہونے والا ہے

'پھر کچھ ہو گیا ہے؟' اس کے لہجے کی جھلاہٹ تھی 'کب تک ایسا ہوتا رہے گا'

------ یہ جان کر دل میں صفِ ماتم بچھ گئی کہ ساری دنیا کے لوگ ہنس بول اور گا بجا رہے تھے مگر اپنے ہاں سناٹا تھا۔" (۱۹)

یہ ایک المناک صورتحال ہے کہ حکومت کی تبدیلی پر عوام کا کوئی ردِ عمل سامنے نہیں آتا۔ اُن کی بے حسی اور جمود ذہن پر گراں گزرتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی ایک بڑا قومی سانحہ تھا جسے آج تک محسوس کیا جا رہا ہے۔ مصنف کا افسانہ "آس کی موت" سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔

"ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی۔ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوجوں کے ہتھیار ڈالنے کی خبر صدر جنرل یحییٰ نے ریڈیو کے ذریعے سنائی تھی ساری قوم رنج و غم میں مبتلا ہو گئی۔" (۲۰)

یہ اندازِ فکر پوری قوم کا تھا جو جنگ کے ساتھ ساتھ اپنی ہمت بھی ہار چکی تھی اور بے بسی میں حالات سے سمجھوتا کیے تھی۔ سیاسی تصویر کا یہ رُخ انتہائی تکلیف دہ لیکن حقیقت پسندانہ تھا جس کی نقاب کشائی اس افسانے میں موجود ہے۔

"بڑی مشکل سے اس نے مغربی محاذ پر جنگ بندی کی خبر کو تسلیم کیا مگر وہ اس بات پر اڑا رہا کہ مشرقی محاذ پر جنگ جاری ہے اور یہ بالکل جھوٹ ہے کہ ہزار ہا شیروں کے پتر بھارت کی قید میں چلے گئے۔" (۲۱)

افسانوی مجموعہ "اک کنکر ٹھہرے پانی میں" کی کہانیوں میں بھی سیاسی شعور کی جھلک واضح نظر آتی ہے خاص طور پر "فاختہ تو پاگل تھی" علامتی انداز میں لکھی گئی۔ جس میں گدھ ٹولے نے راج ہنس کو بادشاہت سے

معزول کر کے زبردستی اقتدار پر قبضہ کر لیا اور طاقت ور جنگلی جانور اور پرندے کمزوروں پر ظلم و ستم کرتے تھے جن میں کوے کی مکاری کا شکار ہونے والی فاختہ بھی شامل ہے۔ جنگل کی فضا میں انتشار پھیل گیا۔ اس صورتحال کو افسانہ نگار نے یوں واضح کیا ہے۔

"ہر طرف بدامنی اور لوٹ مار ہونے لگی۔ طاقت کے بل بوتے پر کوئی بھی دوسرے کا حق چھین لیتا، اسے نقصان پہنچاتا یا قتل کر دیتا۔ غنڈہ گردی اور چھینا جھپٹی، رشوت، سفارش اور اقرباء پروری عام ہو گئی۔ آئے روز چھوٹے اور کمزور پرندے طاقتور پرندوں کا نشانہ بنتے رہتے۔" (۲۲)

سیاسی حالات کے پسِ منظر میں "جنگل کا قانون" افسانہ سیاسی حالات و واقعات کا غماز ہے۔ جنگل میں چھینا جھپٹی عام ہے کوئی باز پُرس کرنے والا نہیں۔ ایسے حالات اگر انسانی معاشرے میں نمایاں ہوں تو انسان خود کسمپرسی کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتا ہے۔ یہاں پر بینکوں کے قرضے، اغوا برائے تاوان، بھتہ خوری، زر، زمین اور زن کی بنیاد پر جھگڑے یوں جیسے نیا جال پرانے شکاری۔ بیسویں صدی میں پہنچ کر بھی انسان جنگل کے قانون سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ آج بھی بعض ممالک میں بادشاہ کو ہر پل دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی اس کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر خود بادشاہ کی مسند پر نہ بیٹھ جائے۔ افسانے کی اُٹھان کا اندازہ دوسرے افسانوں سے منفرد ہے۔ ایمائی انداز میں لکھا گیا یہ افسانہ حقائق کو واضح کرتا ہے۔

"نقلی بادشاہ کو گرفتار کر لیا گیا اور سرِعام پھانسی دے دی گئی۔ وہ پھانسی کے وقت چیختا چلاتا رہ گیا۔ وہ نقلی نہیں اصلی بادشاہ ہے۔ کچھ لوگ جانتے تھے کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مگر کسی میں بادشاہِ وقت کو جھٹلانے کا حوصلہ نہ تھا۔ تب سے اس نگری میں جنگل کا قانون رائج ہے اور شاید ہمیشہ رہے گا۔" (۲۳)

افسانہ "پنجرے میں بسیرا" سیاسی شعور کا عکاس ہے جس میں منشایاد نے ملک میں ردوبدل ہونے والے سیاسی حالات اور لوٹ مار، دہشت گردی کی وارداتوں کو عمدہ انداز سے بیان کیا ہے۔

"صرف بارود سے بھری جیکٹس پہننے اور دھماکے کرنے والے ہی دہشت گرد نہیں۔ ہمارے درمیان بے شمار ایسے دہشت گرد موجود ہیں جن کے ذہنوں میں بارود بھرا ہے۔" (۲۴)

"ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ" میں غربت وافلاس کی چکی میں پستے ہوئے لڑکے کے حالات اور رویوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جو اسے ایک مجاہد بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہاں افسانہ نگار ایک اہم سوال اُٹھاتے ہیں کہ آیا اس لڑکے محمد امین کے جذبہ ءجہاد اور شوقِ شہادت کا الزام کس کے سر ڈالنا چاہیے اور آیا کھیل بڑی سطح پر کھیلا جا رہا ہے اور اس کھیل میں زیادہ ہاتھ کس کا ہے جبکہ قومی سیاست عالمی سیاست کے شکنجے میں ہے۔ سیاسی اور سماجی سطح پر ہونے والی دہشت گردی اور خودکش حملوں کا فروغ انھیں حالات کی پیداوار ہے۔

"چوریوں، ڈاکوں، دھماکوں اور پے درپے خودکش حملوں نے سارے ہی بڑے شہروں کو ہلا رکھ دیا ہے۔ خود رعایا کے نگہبان اور محافظ سب غیر محفوظ ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے حکومت امن وامان قائم رکھنے میں ناکام ہوگئی ہو۔" (۲۵)

شدت پسند طرزِ عمل جہادی تنظیموں کی پیداوار ہے جس نے متوسط طبقے کے ذہنی فکری، روحانی اور اقتصادی استحصال کو جنم دیا اور چارو ناچار غربت وافلاس میں پلا ہوا نوجوان انتہا پسند مجاہد میں بدل جاتا ہے اور ایسی زندگی کا انتخاب کرتا ہے جس کا کوئی مستقبل نہیں۔ مجاہد بن کر شہادت کے مرتبے پر فائز ہونے کا خواب دیکھتا ہے اور اپنے اسی عمل سے خدا کی خوشنودی کی راہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔ معاشی بدحالی فہم وفراست کو مفلوج کر دیتی ہے۔ جینے کی آرزو اُس کے وصیت نامے میں بین السطور سسکتی ہے جو پیغامات کے ذریعے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھجواتا ہے۔ اپنی ماں سے گہری وابستگی کے باوجود اپنے آپ کو اس کے لیے لازم نہیں سمجھتا۔ اُس کے جذبہ ءجہاد اور شوقِ شہادت کا سارا الزام مولوی سراج الدین پر ڈالنا حقائق کے خلاف ہے کیونکہ یہ کھیل بڑی سطح پر کھیلا جا رہا ہے جس سے ہماری خارجہ پالیسی کی کمزوری عیاں ہوتی ہے۔ ہماری بے ہنگم سیاست نے ہی معاشرے کو کمزور کر رکھا ہے جس کی وجہ سے ملک بے حیثیت بن کر رہ گیا ہے۔ منشایاد نے اس افسانے میں بڑی مہارت سے جواب کو سوال میں پوشیدہ کر دیا ہے۔ بظاہر عمومی نوعیت کے اس افسانے میں نسلوں کی بے بسی اور غیر دانشمندانہ رویے موجود ہیں۔

تقسیم ہند کے فسادات، مہاجرین کے مصائب، سقوطِ ڈھاکہ، پاک بھارت جنگیں، تحریک بحالیِ جمہوریت۔ بھٹو کی پھانسی، مارشل لائی ادوار اور بعد کی جمہوری حکومتیں کسی نہ کسی انداز میں ادب کا موضوع بنتی رہیں اور شعراء واد باء نے ان موضوعات کو ادب کا حصہ بنایا۔ جبکہ بین الاقوامی حالات بھی ہمارے ادیبوں اور شعراء کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے۔

اُردو ادب میں مزاحمتی رجحان بھی انہی کی بدولت پیدا ہوا۔ معاشرتی زندگی کا کوئی دور ایسا نہیں جس میں مزاحمت سے متعلق تحریریں نہ لکھی گئی ہوں۔ وہ تاریخ، ادب یا شاعری کی اصناف، سب میں ماحول کی گونج سنائی دیتی اور معاشرتی وسیاسی حالات کی بھول بھلیاں پے در پے سامنے آنے لگتی ہیں۔

منشایاد کے افسانوں میں پاکستانی اور سیاسی زندگی کے خدوخال نظر آتے ہیں۔ پاکستانی تاریخ کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو منشایاد کے ذہن میں موجود نہ ہو۔ بلکہ اُنھوں نے تاریخ کو اپنے افسانوں کا پسِ منظر بنا دیا۔ اُن کے افسانے پاکستان میں موجود طبقات کی عکاسی کرتے ہیں اور انسان کی نفسیات، رشتوں کی اہمیت، خاندانی نظام، باہمی کشمکش اور نفسیاتی دباؤ کا ہر رُخ اُن کی تحریروں سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے معاشرتی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور سیاسی ردوبدل پر اُن کی گہری نظر حالات کی بتدریج عکاس رہی۔ اس طرح وہ اپنے دور کے ہی نہیں بلکہ آنے والے ہر دور کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ کیونکہ ہر دور کا انسان اپنی نفسیات کے مطابق زندگی گزارتا اور اپنے احساس وجذبے کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ جس کو ادیب وشعراء اپنی ذات میں سمو کر شاعری کے دیپ جلاتے اور افسانہ نگار اپنی فکر کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ منشایاد سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے اور سیاسی اُلجھاؤ کو بہت قریب سے دیکھا۔ چنانچہ اس دور کی سیاسی تبدیلیوں پر اُن کی گہری نظر رہی۔ جبکہ گزشتہ سیاسی حالات کے اُتار چڑھاؤ سے بخوبی آشنا تھے۔ تب ہی پاکستان کے ابتدائی مسائل کو اپنے افسانوں کا مرکز بنایا اور اپنے زمانے کے سیاسی ماحول کی جزئیات نگاری میں کمال کر دکھایا۔

حوالہ جات

۱۔ منشایاد، ''بند مٹھی میں جگنو''، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۳۳

۲۔ منشایاد، ''ماس اور مٹی''، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۱

۳۔ منشایاد، ''بند مٹھی میں جگنو''، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۸۳

۴۔ ایضاً، ص ۸۵

۵۔ منشایاد، ''ماس اور مٹی''، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۶

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۷۔ منشایاد، ''خلا اندر خلا''، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۶

۸۔ ایضاً، ص ۲۹

۹۔ منشایاد، "وقت سمندر"، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص۴۶

۱۰۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مرتب، "منشایاد کے منتخب افسانے"، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ص۳۸

۱۱۔ منشایاد، "وقت سمندر"، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص۱۸۱

۱۲۔ ایضاً، ص۱۹۵

۱۳۔ ایضاً، ص۲۱۲

۱۴۔ منشایاد، "درخت آدمی"، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص۲۰۱

۱۵۔ ایضاً، ص۱۶۹

۱۶۔ منشایاد، "تماشا"، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص۱۷

۱۷۔ ایضاً، ص۱۲۴

۱۸۔ ایضاً، ص۱۳۰

۱۹۔ منشایاد، "خواب سرائے"، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص۹

۲۰۔ ایضاً، ص۱۵۸

۲۱۔ ایضاً، ص۱۵۹

۲۲۔ منشایاد، "اک کنکر ٹھہرے پانی میں"، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۱۰ء ص۹۲

۲۳۔ ایضاً، ص۱۶۱

۲۴۔ ایضاً، ص۱۷۴

۲۵۔ ایضاً، ص۶۰